7

دین اور دنیا دونوں کے لئے رمضان کی کیفیت پیدا کرو

(فرمودہ ۱۳- فروری ۱۹۳۱ء)

تشہد، تعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد فرمایا:-

آج کا دن اس لحاظ سے بھی مبارک ہے کہ جمعہ کا دن ہے جو مسلمانوں کی عید ہے اور اس لحاظ سے بھی مبارک ہے کہ رمضان کے ان ایام میں آیا ہے جن میں خدا تعالیٰ اپنے بندے کے زیادہ قریب ہو جاتا ہے اور پھر اس لحاظ سے بھی مبارک ہے کہ رمضان کے اس آخری عشرہ میں آیا ہے جس میں رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک خاص وقت قبولیت دعا کا ایسا آتا ہے جس میں خدا تعالیٰ کی برکات نازل ہوتی ہیں۔[1] پھر ہمارے لئے تو اس لحاظ سے بھی مبارک ہے کہ ہمیں اس دن اس مقام پر جمع ہونے اور عبادت کرنے کا موقع ملا ہے جسے خدا تعالیٰ نے اپنی رضا کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ اور جب ہم یہ بات دیکھیں کہ وہ مسجد جس کے بڑھاتے وقت بعض لوگ خیال کرتے تھے کہ اس قدر نمازی کہاں سے آئیں گے آج اس میں نماز پڑھنا تو کجا سب کے بیٹھنے کے لئے بھی جگہ نہیں تو یہ حالت دیکھ کر ہمارے دل خدا تعالیٰ کے افضال اور احسانات کی وجہ سے شکر و امتنان کے جذبات سے پُر ہو جاتے ہیں۔ آج سے پورے چالیس سال قبل جو جماعت کی بلوغت کا زمانہ ہے یعنی ۱۸۹۱ء میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی مسیحیت کے متعلق کتابیں شائع کرنی شروع کیں اور اب ۱۹۳۱ء ہے گویا آج ہماری جماعت کی عمر بلوغت کو پہنچ رہی ہے۔ بلوغت روحانیہ کے لئے چالیس سال کا عرصہ مقرر ہوتا ہے جو اب پورا ہوتا ہے۔ آج سے چالیس سال قبل ایک شخص نے جو مولوی کہلاتا تھا جس کی نظر باوجود دعویٰ علم کے ہمیشہ نیچے کی طرف رہتی تھی اور جو خدا تعالیٰ کی طرف نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے ایک دوسرے شخص کی نسبت جس

کی برکات کا ظہور آج ہم دیکھ رہے ہیں اعلان کیا کہ میری تائید اور امداد و نصرت سے ہی اس شخص کو شہرت حاصل ہوئی ہے۔ میں نے ہی اسے بڑھایا ہے اب میں ہی اسے نیچے گراؤں گا لیکن جس مولوی نے یہ دعویٰ کیا اس کے در و دیوار گر گئے۔ اس کی اولاد برباد ہو گئی سوائے شاذ کے جو اس کی شہرت کو حاصل کرنا تو درکنار اس کے قریب ترین مقام کو بھی حاصل نہ کر سکے۔ اور عام لوگوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کا کوئی بچہ تو مر گیا کوئی پاگل ہو گیا۔ ایک کے متعلق تو سنا تھا کہ آریہ ہو گیا اور اس کے بعد جلد مر گیا۔ گویا جس شخص نے کہا تھا کہ میں نے ہی اسے بڑھایا ہے اور میں ہی گراؤں گا وہ خود اپنے اعمال سے الجھ کر گر گیا۔ لیکن وہ جسے اس نے گرانا چاہا تھا اس کی آواز کو خدا تعالیٰ نے دنیا کے کناروں تک پہنچا دیا اور اس قدر برکت اور ترقی دی کہ دنیا حیران ہے اور حیران ہوتی جائے گی یہاں تک کہ دنیا میں اسے ایسی قبولیت حاصل ہو جائے گی کہ لوگ خیال کریں گے شاید دنیا اس کی پیدائش کے دن سے ہی اسے مانتی چلی آئی ہے۔ جیسے رسول کریم ﷺ کے دشمن آج خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں آپ پہلے دن سے ہی ترقی کے آثار لے کر آئے تھے۔ انبیاء کے دشمن ایک زمانہ میں تو خیال کرتے ہیں ہم اسے مٹا ڈالیں گے اس کی حقیقت ہی کیا ہے لیکن اور دوسرے زمانہ میں وہ خیال کرتے ہیں یہ شروع سے ہی اسی حالت میں چلا آرہا ہے کہ کوئی اس کا مقابلہ نہ کر سکے اور یہ بڑھتا جائے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق ہم نے خود وہ زمانہ دیکھا ہے جب دشمن کہتا تھا میں اسے مسل ڈالوں گا۔ اب یہ دیکھنا باقی ہے جب دشمن یہ کہے گا کہ شروع سے ہی حالات ان کے لئے ساز گار تھے۔ پس ایک زمانہ تو ہم دیکھ چکے ہیں جب کہا جاتا تھا یہ تعلیم پھیلنے والی نہیں اور اب بھی کہا جاتا ہے کیا ہوا اگر کچھ لوگ ایمان لے آئے عام طور پر لوگ ان باتوں کو ماننے کے لئے تیار نہیں لیکن ایک زمانہ آئے گا جب کہیں گے بھلا ایسی باتوں کو بھی کوئی رد کیا کرتا ہے دنیا کا ان کو مان لینا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ دراصل جاہل اور عالم میں فرق یہی ہے کہ جاہل اس زمانہ کی خبر دیتا ہے جس سے وہ واقف نہیں ہوتا اور عالم صحیح واقفیت کی بناء پر خبر دیتا ہے اس زمانہ کے نہ ماننے والے اگلے زمانہ کی خبر دیتے ہیں کہ یہ تعلیم آہستہ آہستہ رد کر دی جائے گی۔ لیکن اگلے زمانہ کے پیچھے کی خبریں دیں گے کہ اسے کون رد کر سکتا تھا دنیا اس کے ماننے کے لئے بالکل تیار تھی کیونکہ یہ ضرورت زمانہ کے مطابق تھی۔ اور اس طرح دونوں قسم کے لوگ اپنے زمانہ کے سوا دوسرے زمانہ کی خبریں دیں گے اور یہی علامت جاہلوں کی ہوتی ہے۔ لیکن اس ترقی کو دیکھ کر جہاں ہمیں خوشی ہے وہاں ہم پر ایک ذمہ داری بھی عائد ہوتی

ہے۔ہم سے پہلوں نے (ہم پہلے ہی کہیں گے کیونکہ ان میں سے بعض وفات پا چکے ہیں اگرچہ بعض زندہ بھی ہیں) اس مسجد کو وسیع کیا تھا جس سے ہم نے فائدہ اٹھایا اب ہمیں چاہئے اسے اور وسیع کریں تا اگلے فائدہ اٹھائیں۔ نیز مسجد میں جگہ کی اس قدر تنگی ہمیں یہ سبق سکھاتی ہے کہ یہ وقت ہے کہ ہم روحانی اور جسمانی طور پر پھیلیں خدا کی برکات کے نزول کی علامت ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ مومنوں پر عرصہ حیات تنگ ہونے دیتا ہے تا وہ زیادہ قوت کے ساتھ پھیلیں کیونکہ جتنا کسی طاقت والی چیز کو دبایا جائے اتنا ہی وہ زیادہ زور سے باہر نکل کر پھیلنے کی کوشش کرتی ہے۔یورپین لوگوں نے ہوائی بندوقیں تیار کی ہوئی ہیں جن میں ہوا کی زیادہ مقدار کو ایک تنگ جگہ میں روک دیا جاتا ہے۔جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب اسے چلایا جائے تو وہ کئی گز دور تک چھرہ پھینک سکتی ہے۔اسی طرح بعض جگہ تو ہوائی توپیں بھی بنائی گئی ہیں۔پس ہوا کو بھی اگر دبایا جائے تو وہ بھی زیادہ زور کے ساتھ باہر نکلتی ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندوں کو دباتا ہے۔کبھی ان پر جگہ تنگ کرتا ہے، کبھی دوسروں کو ظلم کرنے کا موقع دیتا ہے، کبھی وہ اپنے بڑھے ہوئے حوصلوں کے مقابل میں اپنے محدود سامان اور ذرائع کو دیکھ کر تنگ ہوتے ہیں حتیٰ کہ وہ ہر طرف سے تنگ ہو کر ہوا کی طرح باہر نکلتے ہیں اور اپنے مقدور سے بہت دور تک بڑھ جاتے ہیں۔یہ رمضان کا مہینہ ہے جو خود ترقی کی طرف بلاتا ہے۔ رمض کے معنے ہیں گرمی کا تیز ہو جانا۔ بعض نادان خیال کرتے ہیں رمضان اسے اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا گرمی سے تعلق ہے حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔یہ کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ رمضان ہمیشہ بدل بدل کر مختلف موسموں میں آتا ہے کبھی سخت گرمی میں اور کبھی سخت سردی میں۔اگر اس کا تعلق شمسی مہینوں سے ہوتا تو یہ معنی درست سمجھے جا سکتے تھے مگر اس کا تعلق قمری مہینوں سے ہے پھر اگر رمضان صرف عربوں کے لئے ہوتا تو کہا جا سکتا تھا کہ چونکہ وہ ملک گرم ہے وہاں کی گرمی کی وجہ سے اس کا یہ نام رکھا گیا۔ لیکن اول تو اس کا تعلق قمری مہینوں سے ہے اس لئے سردی میں بھی آتا ہے۔ مثلاً آج کل کونسی گرمی ہے سحری کے وقت گرم کپڑا اوڑھ کر سحری کھائی اور نماز پڑھنی پڑھتی ہے۔ اس وقت کی سردی مضبوط آدمی ہی برداشت کر سکتا ہے کئی کمزوروں کو ان دنوں نمونیا ہو جاتا ہے اس لئے گرمی سے تعلق ہونے کی وجہ سے اس کا نام رمضان نہیں پس اول تو عرب میں بھی یہ سردیوں میں آتا ہے لیکن اگر گرمیوں میں بھی ہوتا تو محض اس وجہ سے اس کا نام رمضان اسی وقت رکھا جا سکتا تھا جب یہ صرف عرب کے لئے ہوتا لیکن دنیا میں کئی ممالک ایسے ہیں جہاں سارا سال ہی سردی رہتی ہے۔ جیسے یورپ۔اور وہ مذہب

جس کا دعویٰ ہو کہ وہ سارے جہان کے لئے ہے ایسا نام کیسے اختیار کر سکتا ہے جو کسی خاص ملک سے مختص ہو۔ پس رمضان کے معنے وہی ہیں جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بیان فرمائے ہیں کہ یہ روحانی گرمی پر دلالت کرتا ہے۔ ان دنوں میں اللہ تعالیٰ انسان کو خاص طور پر روحانی کاموں میں لگا دیتا ہے تا اس کے اندر ایسی گرمی پیدا کرے کہ وہ اس کے فیوض حاصل کر سکے۔ اردو میں بھی گرم ہو جاؤ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ خوب تیزی اور سرگرمی سے کام کرو۔ پھر زور کے ساتھ کام کرنے کے نتیجہ میں بھی گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ عربی کا بھی ایک محاورہ ہے کہ جب لڑائی تیز ہو تو کہتے ہیں حمی یا یہ کہ لڑائی کا تنور گرم ہو گیا۔ تو گرم ہونے کے یہ معنے بھی ہوتے ہیں کہ کام کو پوری جدوجہد سے کیا جائے۔ پس رمضان کے معنے یہ ہیں کہ انسان خدا تعالیٰ کے قرب کے لئے گرمی پیدا کرتا ہے۔ اور غور کرو کیا یہ کم گرمی ہے کہ وہ لوگ جو گیارہ مہینوں میں کبھی تہجد نہیں پڑھتے. ان دنوں وہ بھی پڑھنے لگ جاتے ہیں۔ اور جو کبھی ایک وقت بھی فاقہ نہیں کرتے وہ تمام مہینہ سارا سارا دن بھوکے رہتے ہیں۔ اور جو صدقات اور خیرات سے اسلئے جی چُراتے کہ مال خرچ ہو جائے گا وہ بھی اس مہینہ میں زیادہ خرچ کرتے ہیں۔ غرض وہ چیزیں جو انسان کو زیادہ غافل بنا دیتی ہیں یعنی زیادہ کھانا پینا زیادہ سونا زیادہ باتیں کرنا اور زیادہ مالدار ہونا ان سب میں تبدیلی ہو جاتی ہے اور ان کی بجائے چستی پیدا کرنے والی باتیں انسان اختیار کر لیتا ہے یعنی کم کھانا کم سونا کم باتیں کرنا۔ اور مال خرچ کرنا زیادہ مال جمع کرنے والے بھی ست ہو جاتے ہیں غرضیکہ سب چستی پیدا کرنیوالی باتیں رمضان میں جمع ہو جاتی ہیں۔ کہ انسان کم کھاتا ہے۔ تھوڑا سوتا ہے ذکر الٰہی میں مشغول رہنے کی وجہ سے کم باتیں کرتا ہے اور مال زیادہ خرچ کرتا ہے۔ جو لوگ صدقہ نہ بھی کریں. رمضان کے مہینہ میں وہ اپنی خوراک پر ہی زیادہ خرچ کرتے ہیں ہر شخص روز کہاں پراٹھے کھاتا ہے۔ مگر رمضان میں عام طور پر لوگ پراٹھے کھاتے ہیں۔ یا افطاری پر ہی کچھ نہ کچھ زیادہ خرچ کرتے ہیں۔ غرضیکہ اس مہینہ میں ضرور زیادہ خرچ ہو جاتا ہے۔ اور جو لوگ زیادہ صدقہ خیرات کرنے کے عادی نہیں وہ اپنے جسم کی حفاظت کے لئے ہی زیادہ خرچ کر دیتے ہیں وہ چاہے خدا کے لئے نہ کریں مگر اپنے نفس کے لئے ضرور کر دیتے ہیں۔ غرض رمضان میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان محنت کرے تب ہی اس کے لئے عید ہو سکتی ہے اور اپنے اندر یہ سبق رکھتا ہے کہ اگر انسان واقعی اپنے اوپر رمضان کی حالت طاری کر لے تو اس پر کوئی مصیبت نہیں آ سکتی۔ اور جو ساری کی ساری قوم کم کھائے، کم سوئے، مالی

قربانیاں کرے اور ذکر الٰہی میں مشغول رہے وہ کب ترقی سے محروم رہ سکتی ہے خصوصاً وہ قوم جو اللہ تعالیٰ کے لئے سب کچھ کرے جو سعی و تدبیر بھی کرے اور خدا تعالیٰ کی برکت بھی اس کے شامل حال ہو وہ ضرور کامیاب ہو کر رہتی ہے۔ ہمیں غور کرنا چاہئے کہ کیا واقعی ہم اور ہماری اولادیں رمضان کی حالت میں سے گذر رہی ہیں۔ کیا ان میں کوشش اور محنت کی عادت پیدا ہو رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ احمدیوں کی اولادیں دوسروں سے بہت اچھی ہیں مگر ان کی تربیت کے لئے جس کوشش اور قربانی کی ضرورت ہے ہم ابھی اس کا دسواں حصہ بھی نہیں کر رہے حالانکہ جس طرح بڑوں کے اندر ترقی کرنے کی روح موجود ہے اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ ہماری اولادوں کے اندر ہونی چاہئے اور اس ذمہ داری کو ماں باپ کو اپنی اولاد کے متعلق اور مدرّسین کو قوم کے بچوں کے متعلق اٹھانیکی کوشش کرنی چاہئے۔ اس وقت یہاں چار درسگاہیں ہیں گرلز سکول، ہائی سکول، احمدیہ سکول اور جامعہ احمدیہ ان چاروں میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کے متعلق اگر ہمارے کارکن رمضان کو مدنظر رکھیں اور کوشش کریں کہ ان کے اندر قابلیت کے ساتھ محنت اور جفاکشی کی عادات پیدا ہوں تو ہمارے لئے حقیقی رمضان آسکتا ہے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ انسان کے اندر خواہ کتنا اخلاص کیوں نہ ہو وہ اپنے گرد و پیش کے حالات سے بچپن میں جو اثر قبول کرتا ہے وہ باقی رہ جاتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے حضرت خلیفۃ المسیح الاول کی طبیعت سادہ تھی۔ آپ کھلی کھلی بات کرنے سے ہچکچاتے نہ تھے۔ بعض دفعہ غیرت یا نصیحت کے جوش میں آپ سخت الفاظ بھی کہہ دیتے تھے اور کئی بار آپ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا۔ میاں یہ ہماری تربیت کا نقص ہے۔ ہمارے وقت میں تربیت کے ایسے مواقع نہ تھے جیسے اب ہیں۔ آئندہ نسلوں کے لئے بہتر تربیت کا موقع ہے۔ اور یہ بات ٹھیک ہے۔ ابتدائی لوگ خواہ اخلاص میں کتنی ہی ترقی نہ کر جائیں چونکہ ان کا بچپن ایسے لوگوں میں گذرا ہوتا ہے جو صحیح تربیت سے محروم تھے اس لئے کبھی غصہ کے وقت ان کی زبانوں پر وہی الفاظ جاری ہو سکتے ہیں جو انہوں نے بچپن میں دوسروں سے سنے تھے۔ بخاری میں صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت ابو بکرؓ کے منہ سے بھی ایک گالی کی روایت کی گئی ہے۔ جو ایک شخص کو رسول کریم ﷺ کے حضور میں بے ادبی کرتے ہوئے دیکھ کر بے اختیار آپ کے منہ سے نکل گئی [۲]۔ لیکن جب ایمان پھیل جاتا ہے تو مومن اپنی اولادوں کی بہتر تربیت کر سکتے ہیں۔ (انبیاء کی ذات مستثنیٰ ہے کہ ان کی تربیت اللہ تعالیٰ کرتا ہے)

اور پہلوں سے بہتر بنا سکتے ہیں اس لئے اس بات کو مد نظر رکھنا چاہئے کہ بچوں کے اندر پہلوں کی خوبیاں تو آئیں مگران کی کوتاہیاں نہ آنے پائیں۔ پھر بعض لوگ تربیت تو اچھی کرتے ہیں مگران کے اندر اخلاص پیدا کرنیکی کوشش نہیں کرتے۔ ان کے الفاظ شستہ ہوتے ہیں گفتگو سلجھی ہوئی ہوتی ہے' ادب بھی ان میں ہوتا ہے مگران کے دل ٹھنڈے ہوتے ہیں ان کے اندر وہ گرمی نہیں ہوتی جو دین کے متعلق ان کے ماں باپ میں تھی۔ ایسے لوگ انسان نہیں بلکہ مشینیں ہوتے ہیں جو قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ قوم کو وہی نسل تباہی سے بچا سکتی ہے جس کے اندر ظاہری تربیت کے ساتھ اخلاص بھی ہو۔ اگر صرف ظاہری تربیت ہی ہو انسان کی زبان صاف ہو جسم صاف ہوں اور لباس بھی صاف ستھرے ہوں وہ محنتی بھی ہوں مگران کے دلوں میں دین کے لئے اخلاص نہ ہو تو کسی فائدہ کا موجب نہیں ہو سکتے۔ اور اگر دل میں اخلاص ہو اور تربیت میں نقائص رہ جائیں اور پہلے اثرات ان میں منتقل ہو جائیں تو پھر بھی کما حقہٗ ترقی نہیں ہو سکتی۔ ترقی کے لئے ضروری ہے کہ ظاہری تربیت اور اخلاص دونوں موجود ہوں۔ پس ضرورت ہے کہ یہ دونوں باتیں ہم اپنی اولادوں میں پیدا کریں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی بعض نصیحتیں مجھے بڑی پیاری لگتی ہیں بلکہ یہ فقرہ میں نے غلط کہا انبیاء کی ساری باتیں ہی پیاری ہوتی ہیں یوں کہنا چاہئے کہ ان کی جو باتیں انجیل میں باقی رہ گئی ہیں وہ سب بہت ہی پیاری ہیں۔ ایک موقع پر کچھ لوگ اپنے بچوں کو ان کی مجلس میں لائے۔ شاگردوں نے ان کو جھڑکا مگر آپ نے فرمایا

> "بچوں کو میرے پاس آنے دو اور انہیں منع نہ کرو کیونکہ خدا کی بادشاہت ایسوں ہی کی ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو کوئی خدا کی بادشاہت کو بچے کی طرح قبول نہ کرے وہ اس میں ہرگز داخل نہ ہوگا"۔ [۳]

اس میں آپ نے دو سبق دیئے ہیں۔ اول تو یہ کہ اپنی اولادوں کو ٹھنڈا مت کرو۔ انہیں جوش میں بڑھنے دو تا ان کے اندر سردی پیدا نہ ہو کیونکہ جب بھی قواعد کی بہت سختی سے پابندی کرائی جائے تو اس سے بھی کسی قدر سردی پیدا ہو جاتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے پہلے میرے مسجد میں آنے پر صفیں بنانے کا اور راستہ دینے کا طریق نہ تھا اور لوگ خصوصاً بچے مجمع میں گھستے ہوئے آگے آتے اور مصافحہ کرنے کی کوشش کرتے تھے مگر جب سے صفیں بنانے کا قاعدہ ہوا ہے بعض اوقات پاس سے گذر جانے پر بھی بعض لوگ اس خیال سے چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں کہ قاعدہ کی پابندی میں کہیں غلطی نہ ہو جائے۔ ایسا ہی کوئی قاعدہ وہاں بنایا گیا ہوگا جس پر آپ نے فرمایا کہ

بچوں کو آگے آنے دو- کیونکہ ان کو آگے لانا ہی خدا کی بادشاہت کو لانے کا ذریعہ ہے- ان لوگوں کے نزدیک چونکہ دنیوی ترقیات ہی بڑی کامیابی تھی اس لئے حضرت مسیح ناصری علیہ السلام نے ان کے ہی محاورے کے مطابق خدا تعالیٰ کی بادشاہت کا محاورہ دنیا میں ان کی بادشاہت کے معنوں میں استعمال کیا- اور بتایا کہ اگر یہی اخلاص بچوں کے اندر قائم رہا تو مسیحیت کی بادشاہت دنیا میں بہت جلد قائم ہو جائے گی- دوسرا مفہوم اس فقرہ کا یہ تھا کہ بچوں کے اندر جو جوش و خروش ہے اگر بڑے بھی اپنے اندر اسی قسم کا جوش و خروش پیدا کرلیں تو وہ خدا کی بادشاہت میں داخل ہو سکتے ہیں- یہ بات بھی ہمارے تجربہ سے ظاہر ہے- حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے بڑھیا جیسا ایمان خدا تک پہنچا سکتا ہے- بڑھیا عورت جس بات کو صحیح اور درست سمجھتی ہو خواہ لاکھ دلائل دیئے جائیں اس کے خلاف نہیں مان سکتی-

پس خدا تعالیٰ تک پہنچنے کے لئے انبیاء جیسا ایمان یا پھر کم سے کم بڑھیا جیسا ایمان ضرور ہونا چاہئے- یعنی ایک دفعہ صداقت کو سوچ سمجھ کر مان لینے کے بعد پھر کوئی چیز راستہ میں روک نہ ہونی چاہئے- اور کسی قسم کے اوہام سے قطعاً متأثر نہ ہونا چاہئے- بعض نادان فروعات کو عقل سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں- اصول کو تو عقل کے مطابق دیکھنا چاہئے- مثلاً یہ کہ نماز کی کوئی ضرورت ہے یا نہیں یا اسلام خدا تعالیٰ سے ملا سکتا ہے یا نہیں- لیکن اس بات کو عقل سے سمجھنے کی کوشش کرنا کہ ظہر کے فرض چار کیوں ہیں اور فجر کے دو کیوں بیوقوفی ہے- ایسی تفاصیل بھی روحانی طور پر سمجھ میں آسکتی ہیں- مگر دلیل سے انہیں سمجھنا مشکل ہوتا ہے- کوئی شخص مغرب کے چار فرض پڑھ کر دیکھ لے- اس کے ایمان میں ضرور نقص پیدا ہو جائے گا مگر یہ دلیل کی بات نہیں بلکہ تجربہ کی ہے- اسی طرح کوئی صبح کی نماز میں چار رکعتیں فرض پڑھ کر دیکھے- روحانی طور پر معاً تنزل شروع ہو جائے گا- حالانکہ بظاہر یہ زیادہ عبادت ہے- تو یہ تفاصیل اپنے اندر نہایت باریک حکمتیں رکھتی ہیں- اول تو انسانی دماغ سب کو سمجھ نہیں سکتا- اور جس حد تک سمجھ سکتا ہے وہ کان سے نہیں بلکہ قلب سے سمجھ سکتا ہے- قلب کے اندر ایک نور پیدا ہوتا ہے جس سے کسی حد تک وہ ان کی حکمتوں سے آگاہ ہو جاتا ہے پس بڑھیا جیسے ایمان کے یہ معنی ہیں کہ ایک دفعہ اصول سمجھ لے اور پھر تفاصیل کی باریکیوں میں نہ پڑے- بچوں کی تربیت در حقیقت قومی ترقی کا ذریعہ ہے- اس لئے اپنی اولادوں کے اندر دین کے لئے گرمی اور جوش پیدا کرو تاکہ وہ اپنی زندگی کو دنیا کے لئے مفید اور بابرکت بنائیں- دنیا میں احساس ہی انسان کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیتا ہے- آج

کل مسلمان خیال کرتے ہیں کہ خاص قواعد کی پابندی سے ترقی ہو سکتی ہے۔ حالانکہ ترقی کا انحصار اخلاق پر ہے۔ جب اخلاق مضبوط ہوں تو ظاہری طور پر کوئی قوم خواہ کتنی کمزور کیوں نہ ہو وہ برابر بڑھتی چلی جاتی ہے۔ انبیاء کی جماعتیں کیوں اس قدر ترقی کر جاتی ہیں اس وجہ سے کہ ان کے اخلاق اعلیٰ ہوتے ہیں۔ ان کے راستہ میں جو روک آتی ہے وہ اس پر غالب آجاتے ہیں۔ ان کے دشمن گو بہت مال دار اور صاحب حکومت ہوتے ہیں مگر وہ ذلیل و رسوا ہو جاتے ہیں کیونکہ اخلاق کی تلوار کے مقابلہ میں کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔ لوہے کی تلوار بہت تھوڑے لوگوں کو قتل کر سکتی ہے۔ مگر اخلاق کی تلوار بہت کام کرتی ہے۔ رسول کریم ﷺ اگر لوہے کی تلوار سے دنیا کو فتح کرتے تو آپ ﷺ کی وفات کے بعد یہ تلوار زنگ آلود ہو جاتی۔ مگر چونکہ آپؐ نے اخلاق کی تلوار سے دنیا کو فتح کیا اور نئی زندگی عطاء کی اس لئے چودہ سو سال کے قریب گذر جانے کے بعد بھی آپ ﷺ کی تلوار اسی طرح لوگوں کو اپنے آگے جھکا رہی ہے جس طرح پہلے زمانے میں جھکاتی تھی۔ ہم لوگ کون ہیں؟ وہی جنہیں محمد رسول اللہ ﷺ کی تلوار نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعے ذبح کیا۔ ہم لوگ وہ بکریاں ہیں جنہوں نے اپنی مرضی سے وہ چھری اپنی گردنوں پر چلوائی اس لئے ہمیں نئی زندگی عطا کی گئی لیکن جن کی گردنوں پر وہ زبردستی چلائی جاتی ہے وہ ہمیشہ کے لئے مرجاتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے انبیاء گڈریا اور راعی ہوتے ہیں اور تمام دنیا ان کے سامنے بکریوں کی مانند ہوتی ہے۔ جو لوگ اپنی مرضی سے اپنی گردنوں پر تلوار چلاتے ہیں انہیں نئی زندگی عطا کی جاتی ہے لیکن جن گردنوں پر وہ خفگی اور ناراضگی سے چلائی جائے وہ ہمیشہ کے لئے نابود ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اپنے حالات اور تکالیف یاد کر کے اتنا دکھ نہیں پہنچتا جتنا محمد رسول اللہ ﷺ کی تکالیف اور مصائب کا حال پڑھ کر ہوتا ہے۔ وہ حالات یاد کر کے آج بھی ہچکی بندھ جاتی ہے۔ ایک چھوٹی سی بات ہے۔ رسول کریم ﷺ کی وفات کے بعد جب مسلمانوں کو ترقیات حاصل ہوئیں۔ اور ہر قسم کے آرام و آسائش کے سامان مہیا ہو گئے تو ایک دفعہ ایک عورت نے حضرت عائشہؓ کو دیکھا آپ عمدہ آٹے کی روٹی کھا رہی تھیں اور آپؓ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اس نے دریافت کیا کہ یہ کیا بات ہے۔ آپؓ نے فرمایا میں یہ روٹی کھا تو رہی ہوں کیونکہ خدا کی نعمت ہے مگر تکلیف بھی محسوس کر رہی ہوں کیونکہ رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں چکیاں نہ ہوتی تھیں۔ ہم پتھروں پر دانے کُوٹ کر آٹا بناتے تھے جو بہت موٹا ہوتا تھا اور اس کی روٹیاں رسول کریم ﷺ کھایا کرتے تھے۔ اگر آپ ﷺ آج زندہ ہوتے تو ہم یہ روٹیاں آپ

صلی اللہ علیہ وسلم کو کھلاتے تھے۔ اگرچہ ترقی کا زمانہ آگیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سے تکلیف اور مصائب کا زمانہ گذر گیا پھر یہ تکالیف ہمیں ہی نظر آتی ہیں آپ انہیں تکالیف نہ سمجھتے تھے مگر حضرت عائشہؓ کے گلے کو عمدہ آٹے والی روٹی پکڑ لیتی تھی اور آپ کے آنسو رواں ہو جاتے تھے۔ اب اس کا ہم پر بھی اثر ہوتا ہے اور میں تو جب یہ واقعہ پڑھتا ہوں یا بیان کرتا ہوں تو میرے گلے میں بھی کوئی چیز پھنسنے لگتی ہے۔ حالانکہ بظاہر یہ امر ہنسی کے قابل معلوم ہوتا ہے کیونکہ اب اس زمانہ کو چودہ سو سال گزر چکے۔ خدا تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بعد میں بہت فضل بھی کئے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وفات سے قبل فتوحات بھی دیں' طاقت دی' پھر آپ کے غلاموں کو طاقت اور بادشاہت عطا کی' وہ بڑے بڑے بادشاہوں کے تخت پر متمکن ہوئے اور ان کے زیور اور لباس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی کے مطابق غریب مسلمانوں میں تقسیم کئے گئے گویا بالکل نئے حالات پیدا ہو گئے مگر آج بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکلیف کا کوئی واقعہ پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز دل کو مسلنے لگ گئی ہے۔ یہ بظاہر ایک مجنونانہ سی بات ہے مگر کیا تم میں سے کوئی ہے جو اس جنون کو چھوڑنے کے لئے تیار ہو۔ دنیا کی تمام عقلیں اس جنون پر قربان اور دنیا کی تمام خوشیاں اس رنج پر فدا کرنے کے قابل نظر آتی ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ نے ایسے اخلاق دیئے کہ اس چھری نے آج چودہ سو سال کے بعد بھی ہم سب کو ذبح کر رکھا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق آج بھی ہمارے دلوں پر اپنا اثر ڈال رہے ہیں۔ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وائرلیس کا سب سے بڑا آلہ تھا۔ وائرلیس کا آلہ دس پندرہ ہزار میل پر خبر پہنچا سکتا ہے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وائرلیس کا ایسا زبردست آلہ ہیں کہ نہ صرف اپنی زندگی میں بلکہ آج چودہ سو سال بعد بھی وہ خبر برابر چلی جارہی ہے۔ دراصل یہ ہے صحیح رمضان جو نہ صرف اپنے اندر گرمی پیدا کردے بلکہ دوسروں کے دلوں کو بھی گرما دے۔ اور ضرورت ہے کہ ہم اپنے آپ کو اور اپنی نسلوں کو بھی اسی گرمی سے گرما دیں۔ مومن کو ہر بات میں لوگوں سے آگے ہونا چاہئے اور اسے صبر نہیں آنا چاہئے جب تک سب سے بالا مقام پر نہ پہنچ جائے۔ مومنانہ غیرت یہ کس طرح گوارہ کر سکتی ہے کہ نہ ماننے والے ماننے والوں سے کسی بات میں آگے بڑھ جائیں۔ لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ مومن تو دنیا میں صرف چند لاکھ ہوں اور منکر کروڑوں کی تعداد میں ہوں۔ کیا کوئی زندہ قوم اس ذلت کو برداشت کر سکتی ہے۔ پس تم جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ماننے والے کہلاتے ہو اور آپ کے ذریعہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپاہیوں میں داخل ہو چکے

ہو۔ تمہارا فرض ہے کہ اس وقت تک دم نہ لو جب تک تمام دنیا کو آپ ﷺ کی غلامی میں داخل نہ کرلو۔ پھر کیا کوئی غیرت مند مومن یہ بات برداشت کرسکتا ہے کہ جو اخلاق محمد ﷺ دنیا میں پیدا کرنا چاہتے تھے وہ تو دنیا سے مفقود ہو جائیں اور ان کی جگہ اور باتیں لے لیں۔ کیا یہ گرمی کہلا سکتی ہے۔ گرم جوشی آگے نکلنے کا نام ہے۔ ٹھنڈی چیز ہمیشہ دب کر رہتی ہے۔ گرمی تو اُبل اُبل کر باہر نکلتی ہے جس طرح ہنڈیا اُبلتی ہے۔ رمضان کے معنے یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کا بندہ ٹھنڈا نہیں ہوتا بلکہ اُبل رہا ہے۔ پس ہمیں سوچنا چاہئے کہ کیا ہم اپنی اور دوسروں کی اصلاح کے لئے اسی طرح اُبل رہے ہیں جس طرح اُبلنے کا حق ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہماری جماعت میں اصلاح اور ترقی کا خیال ہے مگر یہ سخت غلطی ہے کہ انسان دوسروں کو دیکھ کر مطمئن ہو جائے اور یہ خیال کرلے کہ میں دوسروں سے بہت ترقی یافتہ ہوں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ اس مقام پر پہنچ جائے جو واقعی خوشی کا مقام ہے۔ کیا اندھے کو دیکھ کر کوئی کانا خوش ہو سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ غنیمت ہے میری ایک آنکھ تو سالم ہے۔ اگرچہ اس میں موتیا ہی اترا ہوا ہے۔ پس اگر ہم یہ خیال کرکے مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں کہ ہم دوسروں سے اچھے ہیں تو ہماری حالت ایسے ہی ہوگی جیسے مشہور ہے کہ ایک سپاہی کہیں سفر پر جا رہا تھا۔ راستے سے دور کسی نے نہایت عاجزی سے اسے پکارا۔ سپاہی اگرچہ عام طور پر سنگ دل ہوتے ہیں مگر کبھی ان میں بھی رحم کے جذبات پیدا ہو سکتے ہیں۔ اسے بھی ترس آگیا اور وہ پکارنے والے کی طرف بڑھا۔ پاس جاکر دیکھا کہ دو آدمی لیٹے ہیں۔ اس نے پوچھا کہو کیا بات ہے۔ ان میں سے ایک نے کہا میری چھاتی پر بیر پڑا ہے۔ ذرا اٹھا کر میرے منہ میں ڈال دینا اس پر سپاہی کا رحم غصہ سے بدل گیا اور اس نے کہا نامعقول انسان! تُو نے خواہ مخواہ میرا سفر خراب کیا۔ کیا خود بیر اٹھا کر منہ میں نہ ڈال سکتے تھے۔ یہ سن کر دوسرا بولا آپ اس قدر خفا نہ ہوں یہ بہت ہی کاہل اور سست آدمی ہے۔ اس سے زیادہ سست تو شاید دنیا بھر میں کوئی نہ ہو تمام رات کُتا میرا منہ چاٹتا رہا مگر یہ اسے دھتکار نہ سکا۔ یہی مثال ہماری ہوگی اگر ہم اس بات پر مطمئن ہو جائیں کہ غیر احمدیوں' عیسائیوں اور ہندوؤں سے ہماری حالت اچھی ہے گو بالکل اچھی نہیں۔ برائی چھوٹی کیا اور بڑی کیا آخر برائی ہے اور اسے دور کرنا چاہئے۔ کیا کوئی عقل مند اس بات پر اطمینان اور خوشی کا اظہار کرسکتا ہے کہ دوسرے کے کھانے کے برتن میں اونس بھر پیشاب پڑا ہے اور میرے میں فقط ایک ڈرام ہی ہے۔ پس ضرورت ہے کہ ہم صرف یہ نہ دیکھیں کہ دوسروں سے اچھے ہیں یا نہیں بلکہ یہ دیکھیں کہ

خدا نے جو اخلاق کا معیار قائم کیا ہے اس پر ہم پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ پھر بعض لوگ بجائے اس کے کہ اپنا نقص دیکھیں اور اس کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں دوسروں کے نقائص دیکھتے رہتے ہیں اور ہمیشہ یہی کہتے ہیں جماعت میں یہ نقص پیدا ہو گیا وہ نقص پیدا ہو گیا۔ مگر یاد رکھو ایسا شخص منافق ہوتا ہے۔ اگر وہ خود اخلاق کے اس مقام پر پہنچا ہوتا جو اسلام کا مطمح نظر ہے تو کبھی ایسی باتیں نہ کرتا کیونکہ جو شخص اس مقام پر پہنچ جائے وہ عام نصیحت تو کر سکتا ہے مگر بے چینی اور بیدلی کبھی نہیں پھیلاتا۔ اب دیکھو میں نے جو کچھ بیان کیا ہے یہ بھی تو جماعت کو نقائص اور کمزوریوں کی طرف ہی توجہ دلائی ہے۔ مگر کیا کوئی ہے جو میرے اس خطبہ کو سن کر یہاں سے مایوس ہو کر اٹھے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ ہر ایک تازہ ہمت لے کر اٹھے گا۔ باوجودیکہ میں نے بھی کمزوریوں کی طرف ہی متوجہ کیا ہے۔ منافق مایوسی پیدا کرتا ہے اس کی غرض اصلاح نہیں ہوتی بلکہ وہ تباہ کرنا چاہتا ہے۔ پس اپنے اخلاق کو اس نقطہ نگاہ سے نہ دیکھو کہ دوسروں کی کیا حالت ہے بلکہ تمہارے پیش نظر وہ مقام ہونا چاہئے جس پر خدا تعالیٰ کھڑا کرنا چاہتا ہے۔ اگر ایسا کرو گے تو ترقی حاصل ہو گی اور تمہارے اندر گرمی پیدا ہو گی۔ اور تم اس مقام پر ضرور پہنچ کر رہو گے۔ جو شخص سیر کے لئے گھر سے نکلے وہ تو جہاں سے چاہے واپس لوٹ سکتا ہے لیکن جس کے پیش نظر کوئی منزل ہو وہ راستہ سے نہیں پلٹا کرتا اسی طرح اگر خدا تعالیٰ کا مقرر کردہ مقام تمہارا مقصود ہو گا تو چلتے جاؤ گے جب تک کہ اس پر نہ پہنچ جاؤ۔ پس اخلاق کے بلند مقام کو حاصل کرنے کے لئے اپنی کوشش کو سیر کی مانند نہ رکھو بلکہ اس سفر کی مانند بناؤ جو منزل مقصود پر پہنچنے کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ اور جب تک اس تک پہنچ نہ جاؤ، دم نہ لو۔ یہی حال تمہاری دنیا کا ہونا چاہئے۔ اس میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہو کیونکہ مومن کسی میدان میں دوسروں سے پیچھے رہنا پسند نہیں کرتا۔ سید احمد صاحب سرہندی کے ایک مخلص مرید اور خلیفہ سید اسماعیل شہید دہلوی نے کہیں سے سن لیا کہ کوئی سکھ اس قدر تیرتا ہے کہ اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ آپ نے دریافت کیا کیا کوئی مسلمان بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کہا گیا نہیں۔ آپ کو اس سے بہت شرم آئی۔ اور آپ نے تیرنے کی مشق شروع کی اور اس میں اتنا کمال حاصل کیا کہ آخر اس سکھ کو مقابلے کے لئے چیلنج دے دیا۔ تو مومن کسی میدان میں بھی شکست کو تسلیم کر ہی نہیں سکتا اس لئے ہمارے اندر ترقی کی وہ روح ہونی چاہئے کہ ہمارا زمیندار دوسرے زمیندار سے، ہمارا لوہار دوسرے لوہار سے، ہمارا ترکھان دوسرے ترکھانوں سے، ہمارا پروفیسر دوسرے پروفیسر سے اور ہمارا وکیل دوسرے وکیل سے

بڑھ کر ہو۔ جب ہم خدا تعالیٰ کی باتوں کو سمجھ اور سیکھ سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ دنیوی علوم کو دوسروں سے بہتر طور پر نہ سیکھ سکیں۔ اور یہ اپنی سستی ہوگی اگر کوئی کوشش نہ کرے وگرنہ مومن کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس کی نظر بہت باریک چیزوں تک پہنچتی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے چودھویں رات کے چاند کی روشنی میں کے شبہ ہو سکتا ہے مگر پہلی رات کا چاند ہر ایک کو نظر نہیں آیا کرتا۔ جو لوگ انبیاء پر ابتداء میں ایمان لاتے ہیں وہ ایسے ہی ہوتے ہیں جو پہلی رات کے چاند کو دیکھتے ہیں اور یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ ان کی نظر بہت تیز ہے۔ پس جو شخص پہلی رات کا چاند دیکھ سکتا ہے وہ دوسری تیسری اور چوتھی کا کیوں نہ دیکھ سکے گا۔ روحانی علم اور معرفت پہلی رات کا چاند ہے اور دنیوی علوم بعد کی راتوں کے۔ اگر ہم خدا کی باتیں سیکھ سکتے ہیں تو دنیوی علوم کیوں نہیں سیکھ سکتے۔ ضرور سیکھ سکتے ہیں مگر مشکل یہی ہے کہ آنکھیں کھول کر دیکھتے نہیں۔ ہمارے اندر یہ احساس ہونا چاہئے کہ ہر میدان میں دوسروں سے آگے نکل جائیں جس طرح ہم دینی علوم میں دوسروں سے آگے ہیں اسی طرح کوشش کرنی چاہئے کہ دنیوی کاموں، دنیوی علموں اور صنعتوں میں بھی دوسروں سے آگے ہوں۔ اور جتنا وقت ان کاموں میں لگائیں اس کی نسبت سے دوسروں سے آگے بڑھ جائیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ ان میں ہی منہمک ہو جائیں بلکہ یہ ہے کہ جتنا وقت ان کے لئے دیں اس کی نسبت سے دنیا سے آگے نکل جائیں۔ اور یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بندہ کے اندر بہترین قابلیتیں رکھی ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خدا تعالیٰ نے ہر فن کے آدمی عطا کئے ہوئے تھے۔ جو اس بات کا ثبوت تھا کہ ان کے ذہن ایسے تیز تھے کہ وہ جس فن میں کوشش کرتے ترقی کر جاتے۔ آپؑ فخر سے اس کا ذکر بھی فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں ہر فن میں کمال رکھنے والے آدمی خدا تعالیٰ نے دیئے ہیں۔ مثلاً حضرت خلیفہ اول کو طب میں بہت کمال حاصل تھا حتی کہ دہلی کے بڑے بڑے اطباء کے مایوس العلاج مریض آپ کے پاس آکر شفا پاتے تھے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ آپ شہرت پسند نہ تھے وگرنہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کا کوئی طبیب آپ کے پایہ کا نہ تھا اور آپ کو یہ ترقی احمدیت میں آکر ہی حاصل ہوئی۔ یہاں آنے سے پہلے آپ اگرچہ شاہی طبیب تھے مگر زیادہ سے زیادہ اس علاقہ کے لوگ آپ سے فائدہ حاصل کر سکتے تھے لیکن یہاں آنے کے بعد خدا تعالیٰ نے آپ کو ایسا ملکہ عطا کیا کہ ہندوستان کے ہر حصہ سے لوگ آپ کے پاس علاج کے لئے آنے لگے۔ حالانکہ یہ جگہ بالکل علیحدہ پڑی تھی اور اس زمانہ میں سفر کی مشکلات بھی تھیں۔

اسی طرح باقی علوم و فنون میں بھی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام کے صحابہ کو خدا تعالیٰ نے بہت برکت عطا کر رکھی تھی حتیٰ کہ چلنے اور دوسرے جفاکشی کے کاموں میں بھی وہ بڑھے ہوئے تھے۔ مولوی یار محمد صاحب ان پر خدا تعالیٰ رحم کرے آج کل ان کے دماغ میں نقص ہے وہ دو گھنٹے میں گورداسپور سے چل کر قادیان اور یہاں سے واپس گورداسپور پہنچ جاتے تھے بلکہ بعض دوستوں نے سنایا کہ بعض اوقات وہ مغرب کے وقت وہاں سے روانہ ہوئے ہیں اور پھر عشاء کی نماز میں جا شامل ہوئے۔ گویا ہر رنگ میں کمال رکھنے والے آدمی آپ کو ملے ہوئے تھے اور اصل بات یہ ہے کہ جب انسان دین میں ترقی حاصل کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ایسی توفیق دے دیتا ہے کہ اگر وہ دنیا میں بھی بڑھنا چاہے تو بڑھ سکتا ہے۔ پس دین و دنیا دونوں کے لئے ہمیں اپنے اندر رمضان کی کیفیت پیدا کرنی چاہئے۔ ہمیں چاہئے آگے بڑھیں اور پھر دوسروں کو بھی بڑھائیں۔ مومن کا کام یہی ہے کہ پہلے خود بڑھتا ہے اور پھر پیچھے والوں کو ساتھ ملاتا ہے پھر بڑھتا ہے اور پھر دوسروں کو بڑھاتا ہے حتیٰ کہ اس مسابقت میں اس کی جان نکل جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے سابق کا نام دیا جاتا ہے۔

میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمارے دین اور دنیا کے حالات کو اس طرح بدل دے کہ اپنی آپ مثال ہوں دین میں بھی ترقی کرنے والے ہوں اور دنیا میں بھی آگے بڑھنے والے ہوں۔ ہم بھی ایسے ہوں اور ہماری آئندہ نسلیں اور ان کی آئندہ نسلیں بھی ایسی ہوں یہاں تک کہ دنیا میں وہ کامل امن اور انصاف اور عدل قائم ہو جائے جو خدا تعالیٰ محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ قائم کرنا چاہتا تھا اور دنیا یہ محسوس کرے کہ اسلام کا آئیڈیل اور نصب العین فرضی اور وہمی نہیں تھا بلکہ فی الواقع قائم ہونے والا تھا

(الفضل ۱۹- فروری ۱۹۳۱ء)

۱؎ بخاری کتاب الصوم باب فضل لیلۃ القدر

۲؎ طبری جلد ۳ صفحہ ۲۱۹ مطبوعہ بیروت ۱۹۸۷ء

۳؎ لوقا باب ۱۸ آیت ۱۶، ۱۷ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی انارکلی لاہور مطبوعہ ۱۹۲۲ء

۴؎ ترمذی ابواب الزھد باب ما جاء فی معصیۃ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم